قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی —— درس ۱۲

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

سورۃ التحریم کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مکتبہ خُدّام القرآن لاھور

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 35869501-03

www.tanzeem.org

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

سورۃ التحریم کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ج تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ ط وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّۃَ اَیْمَانِکُمْ ج وَاللّٰہُ مَوْلٰکُمْ ج وَھُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ②﴾ ...... صدق اللّٰہ العظیم

’’اے نبی (ﷺ)! آپ کیوں حرام کرتے ہیں وہ چیز جو اللہ نے آپ کے لیے حلال ٹھہرائی ہے‘ اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے‘ اور اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ نے تمہاری قسموں کو کھولنے کے لیے طریقہ معین کر دیا ہے‘ اور اللہ ہی تمہارا پشت پناہ اور مددگار ہے‘ اور وہ سب کچھ جاننے والا اور کمالِ حکمت والا ہے۔‘‘

سورۃ التحریم اٹھائیسویں پارے کی آخری سورۃ ہے — اور مطالعۂ قرآنِ حکیم کے جس منتخب نصاب کا درس اِن مجالس میں سلسلہ وار ہو رہا ہے اس کا بحیثیت مجموعی یہ بارہواں درس ہے اور تیسرے حصے یعنی ’’مباحث عمل صالح‘‘ کا تیسرا درس ہے۔ اس منتخب نصاب کے جن دروس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں اِن کے درمیان جو معنوی ربط و تعلق اور منطقی ترتیب ہے اس کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے!

اس منتخب نصاب کا پہلا حصہ چار جامع اسباق پر مشتمل ہے‘ جس میں انسان کی کامیابی اور فوز وفلاح کے چاروں لوازم یعنی ایمان‘ عمل صالح‘ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا بیان ہے۔ دوسرے حصے میں چند ایسے مقامات شامل ہیں جو خاص طور پر ایمان

کے مباحث سے متعلق ہیں۔تیسرے حصے میں اعمالِ صالحہ کی بحث ہے جو جاری ہے۔

ظاہر بات ہے کہ انسانی اعمال میں سب سے پہلے انفرادی سیرت و کردار کا معاملہ زیر بحث آنا چاہیے۔ چنانچہ اس حصے کے پہلے دو اسباق میں انفرادی سیرت و کردار ہی سے متعلق چند اہم پہلو سامنے آئے ہیں۔اوّلین درس' جو سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ المعارج کی درمیانی سترہ ہم مضمون آیات پر مشتمل ہے' میں قرآن نے تعمیر سیرت کے لیے جو بنیادیں فراہم کی ہیں اور تعمیر خودی کا جو پروگرام دیا ہے' اس کا بیان ہے'اور سورۃ الفرقان کے آخری رکوع پر مشتمل دوسرے سبق میں یہ بات ہمارے سامنے آئی کہ ایک مکمل طور پر تعمیر شدہ بندۂ مؤمن کی شخصیت کے کیا خدوخال ہونے چاہئیں! یعنی قرآن مجید کا انسانِ مطلوب کیا ہے' جسے علامہ اقبال مردِ مؤمن سے تعبیر کرتے ہیں۔

اب ہم انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اجتماعیت کی پہلی منزل خاندان اور عائلی نظام ہے۔ اس سے آگے معاشرہ اور پھر اس سے آگے ریاست ہے۔ یہ سارے اس اجتماعیت کے مدارج ہیں جس کا نقطۂ آغاز خاندان ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ خاندان کی بنیاد رشتۂ ازدواج سے پڑتی ہے' یعنی ایک مَرد اور ایک عورت کے درمیان شوہر اور بیوی کا تعلق ایک خاندان کا سنگ بنیاد بنتا ہے۔

چونکہ اجتماعیت کا اوّلین قدم یہی ہے' لہٰذا قرآن مجید میں عائلی نظام سے متعلق مباحث نہایت شرح وبسط اور تفصیل کے ساتھ آئے ہیں اور شوہر و بیوی کے رشتے کے متعلق معاملات اور نکاح وطلاق کے احکام ومسائل کے بارے میں تفصیلی ہدایات بیان ہوئی ہیں۔سورۃ البقرۃ میں کئی رکوع اسی بحث پر مشتمل ہیں۔ پھر سورۃ النساء' سورۃ المائدۃ' سورۃ الاحزاب' سورۃ المجادلۃ' سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم میں اس موضوع پر گفتگو آئی ہے۔فارسی کے اس مشہور شعر کے مصداق کہ

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

چونکہ خاندان انسانی معاشرے اور انسانی تہذیب وتمدن کا بنیادی پتھر ہے اور اسی پر ریاست‘ ملّت اور اجتماعیت کے تمام تصورات کی تعمیر ہوتی ہے‘ لہٰذا اگر خاندان کے ادارے کی تعمیر میں کوئی کجی یا ٹیڑھ رہ جائے تو ظاہر بات ہے کہ پھر وہ کجی آخر تک جائے گی۔ جڑ اور بنیاد میں ضعف رہ جائے تو یہ ضعف معاشرے کی تمام سطحوں پر ظہور کرے گا۔ لہٰذا قرآن مجید خاندان کے اس ادارے کو نہایت مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اسے نہایت صحیح بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے تاکہ اس میں نہ کوئی عدم توازن رہے‘ نہ ہی کوئی اونچ نیچ ہو‘ نہ ظلم وتعدی ہو اور نہ ہی یہ ضعف واضمحلال کا شکار ہو۔

قرآن کریم کے اٹھائیسویں پارے کے آخر میں اس موضوع پر سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم کی صورت میں دو نہایت حسین وجمیل سورتوں کا جوڑا ہمارے سامنے آتا ہے۔ ظاہر بات ہے جتنی سورتوں یعنی سورۃ البقرۃ‘ سورۃ النساء وغیرہ جن میں عائلی زندگی کے معاملات پر بحث کی گئی ہے‘ ان پر اس محدود وقت میں گفتگو نہیں ہوسکتی۔ البتہ سورۃ التحریم (جس کا مطالعہ آج کی اس نشست سے شروع ہو رہا ہے) کی ہر آیت کا ہم قدرے تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ لیکن اس سے قبل میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس سے ان شاء اللہ آپ کو فہم قرآن کے لیے رہنمائی ملے گی اور قرآن مجید کی آیات اور سورتوں میں جو باہمی ربط اور نظم ہے‘ اس کے بارے میں آپ کو ایک بصیرتِ باطنی حاصل ہوگی۔ قرآن مجید میں اکثر وبیشتر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ اب جوڑے ہونے کی نسبت کا تقاضا ہے کہ موضوع زیر بحث کے دو پہلو ہونے چاہئیں۔ ایک یہ کہ مشابہت بھی ہو اور دوسرے یہ کہ اُن میں ایک تقسیم بھی ہو۔ یعنی تصویر کا ایک رُخ یا ایک پہلو اگر ایک سورت میں آیا ہے تو اس کا دوسرا رُخ اور دوسرا پہلو دوسری سورت میں آئے۔ جیسے قرآن مجید کی آخری دو سورتیں ’’معوّذتین‘‘ ہیں۔ ان دونوں کا مضمون ایک ہی ہے۔ تعوّذ کا ایک پہلو سورۃ الفلق میں آ گیا ہے‘ یعنی اُن وبالوں اور بلاؤں سے پناہ کے لیے اللہ سے دعا کرنا جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں۔ اور تعوّذ کا دوسرا رُخ سورۃ الناس میں آ گیا ہے‘ یعنی اُن وسوسوں اور بہکاووں سے پناہ کے لیے اللہ سے دعا

کرنا جو شیطان اور اس کی صلبی و معنوی اولاد انسان کے دل و دماغ اور باطن میں پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح عائلی زندگی کے بھی دو پہلو ہیں' جنہیں تصویر کے دو رُخ یا معاملات کے دو اجزاء کہہ لیجیے' جو سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم میں سامنے آتے ہیں۔

اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ان سورتوں کا بنیادی اور مرکزی مضمون کیا ہے! خاندان کے جذبات کا لحاظ رکھنا اور ایک دوسرے کے احساسات کا پاس کرنا ایک بنیادی قدر ہے۔ جس گھر میں شوہر اور بیوی کے مابین یہ کیفیت نہیں ہے تو یوں سمجھئے کہ زبردستی اور مارے باندھے کا ایک رشتہ ہے جو قائم ہے۔ اس رشتہ میں چاشنی اور باہم محبت و اُلفت درکار ہے۔ اگر وہ موجود نہیں ہے تو ایسا گھر اِس دنیا میں جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔ الغرض عائلی زندگی میں دو رویے ہیں جن میں انسان انتہا تک چلا جاتا ہے۔ ایک رویہ یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان عدم موافقت ہے' دونوں کے مزاجوں میں کوئی ایسا بُعد ہے کہ باہم موافقت نہیں ہو پا رہی تو اس کی انتہا طلاق ہے۔ یہ مضمون سورۃ الطلاق میں آیا ہے۔ سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق میں مشابہت دیکھئے کہ دونوں کے آغاز میں براہِ راست نبی اکرم ﷺ سے خطاب کیا گیا ہے۔ البتہ سورۃ الطلاق کے شروع میں طلاق کا ذکر ہے' مگر چونکہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں طلاق کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں لہٰذا شروع میں تو خطاب آنحضور ﷺ سے ہے لیکن فوراً بعد ہی ﴿اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ سے آخر آیت تک جمع کا صیغہ آیا ہے۔ یعنی دراصل یہ بات رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے آپؐ کی وساطت سے مسلمانوں سے کہی جا رہی ہے کہ اے مسلمانو! اگر تمہارے یہاں کوئی اس قسم کی صورتِ حال پیش آ جائے کہ طلاق ناگزیر ہو جائے تو یہ روش اختیار کرو' یہ اس کے قواعد وضوابط اور شرائط وآداب ہیں۔

یہ بات تمدنی اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ بعض معاشروں اور بعض مذاہب نے طلاق کو عائلی زندگی سے خارج کر دیا ہے' جبکہ اسلام کا نظام بڑا متوازن اور معتدل ہے۔ اسلام کے عائلی نظام میں ایک طرف تو طلاق کو حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض چیز کہا گیا ہے اور ساتھ ہی بیوی کی ناپسندیدہ عادتوں سے

صرفِ نظر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک حدیث شریف میں' جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ انتباہ فرمایا:

((لَا یَفْرَكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ کَرِهَ مِنْهَا خُلُقًا رَضِیَ مِنْهَا آخَرَ)) (۱)

یعنی کسی مؤمن کو اپنی بیوی سے اس کی کسی ناپسندیدہ عادت کی وجہ سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اگر اس کی کوئی ایک عادت اسے ناپسند ہے تو اس کی کوئی دوسری عادت اسے اچھی بھی تو لگتی ہے۔

اس ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جانبین ایک دوسرے کی خوبیوں اور بھلائیوں پر نگاہ رکھیں تاکہ حتی الامکان کوشش ہو سکے کہ ان کے درمیان موافقت پیدا ہو جائے۔ لیکن اگر کوشش کے باوجود کسی وجہ سے موافقت پیدا نہیں ہو رہی تو پھر اسلام ان دونوں کو زبردستی باندھ کر رکھنا نہیں چاہتا۔ اس زبردستی کے بندھن سے معاشرے میں خیر پیدا نہیں ہوتا' شر پیدا ہوتا ہے' لہٰذا طلاق کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ البتہ اس کے جو قواعد وضوابط اور آداب وشرائط ہیں انہیں بھی قرآن میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اِن آداب وشرائط کو ہمارے معاشرے میں عام طور پر ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور کوئی شوہر غصہ میں آ کر ایک ہی وقت میں آخری قدم اٹھا بیٹھتا ہے اور ایک دفعہ ہی تین طلاقیں دے دیتا ہے اور بعد میں پچھتاتا ہے۔

دوسری طرف عائلی زندگی میں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک دوسرے کی دلجوئی اور خوشنودی حاصل کرنے کا معاملہ حدِ اعتدال سے بڑھ جائے اور شوہر اپنی بیوی کی رضاجوئی میں اِس حد تک چلا جائے کہ شریعت کے احکام ٹوٹنے لگیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی کو خوش اور راضی کرنے کے لیے یا اس کی کوئی فرمائش پوری کرنے کے لیے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال ٹھہرا لے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا تو سرے سے کوئی امکان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں تھا' معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ البتہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض ازواجِ

(۱) صحیح مسلم' کتاب الرضاع' باب الوصیة بالنساء۔

مطہرات رضی اللہ عنہن کی دلجوئی ملحوظ رکھی۔اگرچہ یہ اپنی جگہ پسندیدہ اور مطلوب ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دی ہے' رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :((خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ' وَاَنَا خَیْرُکُمْ لِاَھْلِیْ))(۱) ''تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہترین طرزِ عمل اختیار کرنے والے ہیں' اور جان لو کہ میں تم میں سے اپنے گھر والوں کے لیے بہترین روش اختیار کرنے والا ہوں''۔اگرچہ یہ ایک پسندیدہ طرزِ عمل ہے مگر ایک خاص واقعہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فہمائش کی گئی۔اس لیے کہ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے معاملہ میں یہ ہو چکا تھا کہ انہوں نے اپنے ذاتی ذوق کی بنا پر اونٹ کے گوشت کا استعمال ترک کر دیا تھا لیکن یہود نے یہ سمجھ لیا کہ اونٹ کا گوشت حرام ہے۔گویا ایک نبی کے ذاتی ذوق کے معاملہ کو شریعت کا جزو بنا لیا گیا اور اونٹ کے گوشت کی حرمت بنی اسرائیل کی شریعت میں مستقل ہو گئی۔

میں نے جس خاص واقعہ کا حوالہ دیا ہے وہ احادیث میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔سورۃ التحریم میں اس واقعہ کی طرف محض اشارہ ہے۔احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ آپؐ عصر کی نماز کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے سب ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے یہاں تشریف لے جاتے۔ازواجِ مطہراتؓ کو آپؐ کے ساتھ جو محبت اور جو تعلقِ خاطر تھا اس کے پیشِ نظر ہر زوجہ محترمہؓ کی یہی تمنا اور کوشش ہوتی تھی کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہات کا مرکز بنے اور زیادہ سے زیادہ وقت اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بابرکت صحبت میں رہنے کا موقع نصیب ہو۔لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملے میں کامل عدل سے کام لیتے تھے اور ہر زوجہ محترمہؓ کے یہاں مساوی وقت دیتے تھے۔ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے یہاں معمول سے زیادہ دیر لگی۔ہوا یہ کہ انؓ کے یہاں کہیں سے ہدیتاً شہد آیا ہوا تھا' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ شہد بہت مرغوب تھا اس لیے اُمّ المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہد پیش کیا جس کے نوش فرمانے کے باعث آپؐ انؓ کے یہاں زیادہ دیر تک ٹھہرے۔پھر

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب المناقب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' باب فضل ازواج النبی۔

کئی روز تک یہی معمول ہوا۔ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے مل کر تدبیر کی کہ آپؐ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے یہاں شہد پینا چھوڑ دیں تا کہ آپؐ انؓ کے یہاں معمول سے زیادہ وقت نہ دے سکیں۔ وہ شہد مغافیر کے پھولوں کا تھا جس میں کچھ بساند اور ہینک ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہد کے استعمال کے بعد جب انؓ کے حجرے میں تشریف لے جاتے تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتیں کہ آپؐ کے مُنہ سے مغافیر کی بساند آتی ہے۔ ان دونوں نے چند دیگر ازواج مطہراتؓ کو بھی اس میں شریک کر لیا۔ آپؐ چونکہ نہایت نفاست پسند تھے اور جب آپؐ کی متعدد ازواجِ مطہراتؓ نے یہ بات کہی تو آپؐ نے عہد کر لیا اور قسم کھا لی کہ آئندہ آپؐ یہ شہد استعمال نہیں فرمائیں گے۔

ہمارے دین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مقام حاصل ہے کہ اگر آپؐ سے کوئی معمولی بات بھی ظہور میں آ جائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اب آپؐ نے چونکہ اپنی ازواجِ مطہراتؓ کی خوشنودی کے لیے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ ایک شے اپنے اوپر حرام کی تھی اس لیے یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اُمت اس شے کو ہمیشہ کے لیے حرام یا کم از کم حد درجہ مکروہ سمجھنے لگے' یا اُمت کے لوگ یہ خیال کرنے لگیں کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز اپنے اوپر حرام کر لینے کی دین میں اجازت ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سورۂ مبارکہ نازل فرما کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام پر ٹوک دیا۔

اس ٹوکنے سے متعلق یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنے کے مطلق اور قطعی اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ نبی بھی اگر کسی شے کو حلال یا حرام قرار دیتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو' خواہ وہ اشارہ وحیٔ جلی کی صورت میں ہوا ہو یا وحیٔ خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔

اس سورۂ مبارکہ پر تدبر کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب ایک ذرا سی بات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ صرف ٹوک دیا گیا اور اس کی اصلاح کی گئی بلکہ اس کا ایک سورۃ میں ذکر کر کے اس کو ابدالآباد تک کے لیے قرآن مجید میں محفوظ کر دیا گیا' تو

اس سے قطعی طور پر یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے جن اعمال‘ افعال‘ احکام اور ہدایات پر قرآن مجید میں کوئی گرفت یا اصلاح موجود نہیں ہے وہ سراسر حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی منشاء و مرضی کے مطابق ہیں اور ان کا اتباع ہم پر لازم ہے۔ اس بات سے سنت کی حجیت وفرضیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ان تمہیدی باتوں کے بعد اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ﴾ ’’اے نبی (ﷺ)! آپ اُس چیز کو کیوں حرام ٹھہراتے ہیں جسے اللہ نے آپؐ کے لیے حلال کیا ہے؟‘‘ انداز استفہامیہ ہے لیکن مقصود آنحضور ﷺ کو ٹوکنا اور متنبہ کرنا ہے۔ ﴿تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ﴾ ’’کیا آپؐ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں؟‘‘ آیت کے اس حصہ سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا یہ فعل اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر نہیں تھا‘ بلکہ بیویوں کی خوشنودی کی وجہ سے تھا‘ جنہوں نے یہ صرف اس لیے چاہا تھا کہ آپؐ شہد پینے کی خاطر حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ دیر قیام نہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سبب کو یہاں بیان فرما کر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو متنبہ فرما دیا کہ وہ نبی کی ازواج ہونے کی نازک ذمہ داریوں کا لحاظ رکھیں۔ آگے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ①﴾ ’’اور اللہ معاف کرنے والا‘ رحم کرنے والا ہے‘‘۔ آیت کے اس حصہ میں نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپؐ نے اپنی بیویوں کی خوشنودی کی خاطر ایک حلال چیز کو حرام قرار دینے کا جو کام کیا ہے وہ کوئی گناہ نہ تھا لیکن آپؐ کے منصب کی اہم ترین ذمہ داریوں کے اعتبار سے مناسب نہ تھا‘ لہٰذا اللہ نے صرف ٹوک کر اصلاح کی طرف متوجہ کرنے پر اکتفا فرمایا۔

اس مقام پر ٹھہر کر ذرا اس بات پر غور فرمالیجیے کہ جب نبی اکرم ﷺ کو اپنی ازواج کی خوشنودی کی خاطر ایک حلال چیز کو اپنے لیے حرام قرار دینے پر اس شدّ و مدّ کے ساتھ ٹوک دیا گیا ہے تو اُن لوگوں کا آخرت میں کتنا سخت اور شدید مؤاخذہ ہو گا جو اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے حرام کو حلال کر لیتے ہیں اور پھر اس کا مسلسل اور مستقل ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا: ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ﴾ ’’اللہ ایسی قسموں کو کھولنے کا ایک راستہ تمہارے لیے مقرر کر چکا ہے‘‘۔اس میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۸۹ کی طرف اشارہ ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی قسم کھا لی ہے اور اب اس کو کھولنا ہے تو اس کے لیے کفارہ مقرر ہے‘ اور وہ یہ کہ دس مساکین کو کھانا کھلائے۔ وہ کھانا ایسا ہو جو انسان اپنے اہل وعیال کو کھلاتا ہے–یا دس مساکین کو لباس مہیا کرے–یا کسی ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرائے–اور اگر کسی کو ان میں سے کسی کی بھی استطاعت نہ ہو تو اس کا بدل یہ مقرر کیا گیا کہ ایسا شخص تین دن کے روزے رکھے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قسم کو کھولنے اور عہد کی پابندی سے نکلنے کا اللہ تعالیٰ طریقہ معین فرما چکا ہے۔اس لیے جب بھی کوئی ایسی صورت پیش آجائے تو کفارہ ادا کر کے قسم کھول دو۔ آگے فرمایا:﴿وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ﴾ ’’اور (یہ بات جان لیجیے کہ) آپؐ کا اور سب مسلمانوں کا مددگار (حامی اور پشت پناہ) صرف اللہ ہی ہے‘‘۔لہٰذا اسی کی رضا اور خوشنودی کو ہمیشہ مقدم رکھنا چاہیے۔ ﴿وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝﴾ ’’اور وہی ہے سب کچھ جاننے والا‘ کمالِ حکمت والا‘‘۔یعنی وہ جو بھی حکم دیتا ہے اپنے علمِ کامل کی بنیاد پر دیتا ہے اور اس کی حکمتِ بالغہ اس حکم میں شامل ہوتی ہے۔

سورۃ التحریم کی ابتدائی دو آیات میں ہمارے سامنے خاندانی و عائلی زندگی کے بارے میں ایک بڑی بنیادی بات آ گئی کہ بیویوں کی رضا جوئی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا‘ ان کے ساتھ نرمی‘ محبت‘ مودّت‘ الفت اور اُن کے جذبات کا پاس اور لحاظ رکھنا‘ یہ تمام چیزیں اصلاً مطلوب اور پسندیدہ ہیں‘ لیکن ایک خاص حد تک۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں یہ جذبہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور شریعت کے احکام ٹوٹنے شروع ہو جائیں۔ لہٰذا ایک بندۂ مؤمن کو ہمیشہ اور ہر وقت اعتدال کی روش اختیار کرنی چاہیے اور اس معاملہ میں ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔ آیات ۳ تا ۵ میں فرمایا:

﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ

اَنۡۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الۡعَلِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۳﴾ اِنۡ تَتُوۡبَاۤ اِلَی اللّٰهِ فَقَدۡ صَغَتۡ
قُلُوۡبُكُمَا ۚ وَاِنۡ تَظٰهَرَا عَلَیۡهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوۡلٰىهُ وَجِبۡرِیۡلُ وَصَالِحُ
الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ بَعۡدَ ذٰلِكَ ظَهِیۡرٌ ﴿۴﴾ عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنۡ طَلَّقَكُنَّ اَنۡ یُّبۡدِلَهٗۤ
اَزۡوَاجًا خَیۡرًا مِّنۡكُنَّ مُسۡلِمٰتٍ مُّؤۡمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ
وَّاَبۡكَارًا ﴿۵﴾﴾

’’اور جب نبی (ﷺ) نے ایک بات اپنی بیوی سے راز میں کہی تھی‘ پھر جب اُس بیوی نے وہ راز (کسی اور پر) ظاہر کر دیا‘ اور اللہ نے نبی (ﷺ) کو اُس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی تو نبی (ﷺ) نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا۔ پھر جب نبی (ﷺ) نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا: آپ کو اس کی خبر کس نے دی؟ نبی (ﷺ) نے کہا ’’مجھے اُس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا اور خوب باخبر ہے‘‘۔ اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو (یہی تمہارے لیے زیبا ہے) تمہارے دل تو (خدا کی طرف) مائل ہی ہیں‘ اور اگر تم نبیؐ کے خلاف ایکا کرو گی تو اس کا حامی اللہ ہے اور جبریل اور تمام نیکوکار مسلمان‘ اور مزید برآں فرشتے بھی اس کے مددگار ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمہیں طلاق دے دے تو اُس کا پروردگار تمہارے بدلے میں تم سے بہتر بیویاں اس کو عطا کر دے‘ اطاعت شعار‘ مؤمنہ‘ فرمانبردار‘ توبہ کرنے والیاں‘ عبادت گزار‘ ریاضت کرنے والیاں‘ شوہر آشنا اور کنواریاں‘‘۔

ان آیات میں نبی اکرمﷺ کی عائلی زندگی کے ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ واقعہ کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں‘ کیونکہ یہ آیات اپنے مفہوم و مدعا کو خود واضح کر رہی ہیں۔ نبی اکرمﷺ نے کوئی راز کی بات اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی ایک سے کہی اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرما دی کہ یہ بات کسی اور کو نہ بتائی جائے۔ ان زوجہ محترمہؓ سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے کسی دوسری زوجہؓ کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ نبی اکرمﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس افشائے راز کی خبر دے دی۔ اس پر حضورﷺ نے نہایت ملائمت‘ شفقت اور نرمی سے اُن زوجہ محترمہؓ کو اشارتاً جتلا

دیا کہ یہ بات آپؐ کے علم میں آ گئی ہے۔ ﴿عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ﴾ کے الفاظ میں آپؐ کے حسنِ معاشرت کی اعلیٰ مثال کا ذکر ہے کہ آپ نے پوری بات جتلانا اور پورے کا پورا الزام دینا پسند نہ فرمایا۔ آپؐ نے شکوہ و شکایت میں بھی التفات و ملائمت کے پہلو کو پیشِ نظر رکھا' تا کہ ان زوجہ محترمہؓ کو انتباہ ہو جائے۔ اس پر اُن زوجۂ محترمہؓ نے پلٹ کر سوال کیا کہ ''آپؐ کو یہ کس نے بتایا؟'' ہوسکتا ہے کہ انہیں یہ گمان ہوا ہو کہ میں نے جن کو یہ بات بتائی تھی شاید انہوں نے حضورﷺ کو بتا دی۔ اس لیے اپنے شک اور سوئے ظن کو رفع کرنے کے لیے انہوں نے حضورﷺ سے وضاحت چاہی کہ آپؐ کو کس نے بتایا!۔ اس کے جواب میں حضورﷺ کے جو الفاظ آئے ہیں ان میں تھوڑا سا اظہارِ ناراضگی کا پہلو بھی ہے' کیونکہ یہ معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ یہ مجھے کس نے بتایا' اصل بات تو یہ ہے کہ ایک راز کی بات تھی' اسے راز ہی رہنا چاہیے تھا۔ لہٰذا حضورﷺ نے جواب میں فرمایا: ''مجھے تو اُس خدا نے بتایا ہے جو العلیم بھی ہے اور الخبیر بھی''۔ اس واقعے کے اجمالی ذکر کے بعد اب اللہ تعالیٰ کی جانب سے خطاب ہو رہا ہے۔

یہاں اس بات کو بھی جان لیجیے کہ عائلی زندگی میں مَرد کا اپنی بیوی کے حق میں نرم ہونا' شفیق ہونا' شوہر اور بیوی کے درمیان محبت و الفت' رحمت و شفقت اور مودّت کا پایا جانا مطلوب ہے۔ لیکن اس میں اگر شوہر کی طرف سے نرمی زیادہ ہو جائے اور خاندان کے ادارہ کو مستحکم رکھنے کا بنیادی اصول یعنی ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ کا اہتمام و التزام پوری طرح باقی نہ رہے تو خاندانی زندگی کے بنیادی ڈھانچے کو ضعف پہنچے گا۔ پھر جب معاملہ خاص طور پر نبی اکرمﷺ کا ہو تو اُس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے' کیونکہ آپؐ کا ہر عمل اُمت کے لیے نمونہ ہے۔ سورۃ الحجرات میں بہت زور دے کر فرمایا گیا ہے کہ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ ''خوب جان لو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسولؐ موجود ہے''۔ اس میں ایک بڑا لطیف نکتہ ہے کہ نبی اکرمﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کا تو ایک ہی پہلو ہے' کہ آپؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں اور ہم اُمتی ہیں' آپؐ ہمارے آقا ہیں' ہم آپؐ کے غلام ہیں' اور تو کوئی رشتہ اور نسبت نہیں ہے!

لیکن صحابہ کرام اور صحابیات رضی اللہ عنہم کا معاملہ بہت مختلف تھا۔صحابہؓ میں سے کوئی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا بھی ہے‘اب چچا ہونے کے اعتبار سے وہ بڑا ہے‘ حضورؐ بھتیجے ہیں‘ بھتیجے کا رشتہ بہرحال چھوٹا ہے۔اب اگر کہیں حضرت حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما اپنی اس حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کر لیتے جو بڑا اپنے چھوٹے کے ساتھ اختیار کرتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ رسالت مجروح ہوسکتی تھی۔لہٰذا آگاہ کر دیا گیا‘ متنبہ کر دیا گیا: ﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ اچھی طرح جان رکھو کہ تمہارے مابین صرف محمدؐ نہیں ہیں‘ بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے‘لہٰذا آپؐ کی اس حیثیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو۔

اسی بات کا اطلاق ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر بھی ہوگا کہ بیوی ہونے کی حیثیت سے ان کی طرف سے ناز کا بھی اظہار ہو جائے گا۔لہٰذا اُن کو بھی متنبہ کر دیا گیا کہ ٹھیک ہے اے عائشہؓ! کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے شوہر ہیں‘ اے حفصہؓ! ٹھیک ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے شوہر ہیں‘ لیکن ہر دم یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ اللہ کے رسول بھی ہیں اور یہ بہت نازک مقام ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام اور ادب کو کسی درجہ میں بھی ضعف پہنچنے کا امکان ہو تو اس کے بارے میں ہمیشہ سخت ترین تنبیہہ نظر آئے گی۔جیسے سورۃ الحجرات میں ہے کہ: ﴿اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲﴾ ’’مبادا تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں اور تم کو خبر تک نہ ہو‘‘۔اگر معاملے کی یہ خاص صورت پیشِ نظر نہ ہو تو پھر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے کچھ سوئے ظن کی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔لیکن یہ حقائق جو میں نے بیان کیے ہیں‘ اگر مدّ نظر رہیں تو پھر کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوگی۔

زیر بحث معاملہ دو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہما کے درمیان پیش آیا۔ایک نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا راز دوسری پر ظاہر کر دیا۔اب دونوں کے لیے اللہ کا حکم ہے کہ: ﴿اِنْ تَتُوْبَا اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ﴾ ’’اگر تم دونوں اللہ کی جناب میں توبہ کرو (اظہارِ ندامت کرو اور اللہ سے استغفار کرو) تو (یہی تمہارے حق میں بہتر ہے‘ کیونکہ) تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں‘‘۔یعنی دلوں میں تو یہ کیفیت ہے ہی‘ پشیمانی اور

ندامت کے جذبات تو ہیں ہی۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی مان ہوتا ہے۔ وہی بات جسے میں نے ناز سے تعبیر کیا ہے۔ اس ناز کی وجہ سے ندامت اور پشیمانی کے الفاظ زبان پر نہیں آ رہے' طبیعت ہچکچا رہی ہے۔ تو گویا ترغیب کا یہ نہایت بلیغ انداز ہے کہ فرمایا گیا: ''تمہارے دل تو مائل ہو ہی گئے ہیں''۔ جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کہ ذرا ہمت کرو' اصل میدان تو تم سر کر ہی چکے ہو' کٹھن منزل تو تم نے طے کر لی ہے' اب تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے' ہمت نہ ہارو' حوصلہ سے کام لے کر اس مرحلہ سے بھی گزر جاؤ۔

اس مقام پر بعض مفسرین کو سخت مغالطہ ہوا ہے۔ انہوں نے ''صَغَتْ'' کا مفہوم کسی شے سے انحراف سمجھا ہے' حالانکہ یہ لفظ کسی شے کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کا مفہوم رکھتا ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے بھی یہاں ''صَغَتْ'' کا ترجمہ ''جھک جانا'' کیا ہے۔ آیت کا اسلوب بھی یہی بتا رہا ہے کہ ''اگر تم اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں (جھک ہی چکے ہیں)''۔ ذرا سی یہ ہچکچاہٹ جو شوہر اور بیوی کے نفسیاتی تعلق کی وجہ سے حائل ہے' اس جھجک کو دور کرو اور اپنی خطا کا اعتراف کرو۔ اللہ سے بھی اس کے لیے استغفار کرو اور نبی ﷺ سے بھی معذرت کرو کہ ہم سے خطا ہوئی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں اگر بظاہر درشتی کا پہلو ہو' سختی کا اسلوب ہو تو دیکھنا یہ ہو گا کہ خطاب کن سے ہے! بسا اوقات شفقت اور محبت ہی کے اظہار کے لیے بظاہر سختی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک شفیق والد اپنے بچے کی تربیت کے لیے بعض اوقات سختی اور درشتی کا انداز اختیار کرتا ہے' لیکن کیا یہ گمان ہوسکتا ہے کہ باپ کا دل اپنے بچے کی محبت سے خالی ہے؟ البتہ یہاں ایک بات یہ جان لیجیے کہ ع ''جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے'' کے مصداق جن کے مقامات بلند ہوتے ہیں ان کی چھوٹی سی بات پر بھی جب گرفت ہوتی ہے تو بظاہر انداز بڑا سخت ہوتا ہے۔ عربی کا ایک مقولہ ہے کہ ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ''' یعنی عام لوگوں کے لیے جو کام بڑی نیکی کا سمجھا جائے گا ہوسکتا ہے کہ وہی

کام اللہ تعالیٰ کے مقربین اولیاء اور محبوب بندوں کے لیے تقصیر قرار پائے اور ان کے مرتبہ کے اعتبار سے قابل گرفت شمار ہو جائے۔ لہٰذا یہ معاملہ مراتب اور درجات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ یہی اسلوب ہم قرآن مجید کے بعض مقامات پر دیکھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کے ساتھ خطاب میں بھی بظاہر کچھ سختی کا اظہار ہو رہا ہے۔ جیسے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ① اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ② وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ③ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ④ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ⑤ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ⑥﴾

''ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی۔ اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خبر، شاید وہ سدھر جائے! یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو! جو شخص بے پروائی برتتا ہے، اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔''

بظاہر اِس اسلوب میں کچھ سختی ہے، لیکن درحقیقت اس انداز میں محبت، شفقت اور عنایت پنہاں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے گرفت کا انداز نظر آتا ہے، جبکہ بڑی معمولی بات ہے اور عام لوگوں کے لیے غلطی بھی نہیں ہے، لیکن رسول اور نبی ہونے کے اعتبار سے اس پر بھی روک ٹوک ہو رہی ہے اور بظاہر انداز سخت نظر آ رہا ہے۔ اسی اصول کا ہم یہاں بھی اطلاق کریں گے کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنا مقام اور مرتبہ پہچانو، تم اُمّہات المؤمنین ہو، پوری اُمت کی خواتین کے لیے قیامت تک تمہارا طرزِ عمل نمونے کا طرزِ عمل ہو گا۔ لہٰذا تمہارا طرزِ عمل بڑا اعلیٰ، معیاری اور آئیڈیل ہونا چاہیے۔ اس میں ذرا سی کمی کسی پہلو سے بھی ہو تو ممکن ہے کہ وہ پہلو اُمت کی خواتین کے لیے بڑی بڑی لغزشوں کا سبب بن جائے۔ اس لیے یہاں الفاظ میں بظاہر کچھ سختی ہے، لیکن اس سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں کوئی معمولی سا سوئے ظن بھی دل میں ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

آیت مبارکہ کی طرف پھر رجوع کیجئے، فرمایا: ﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ﴾ ''اگر تم اللہ کی جناب میں توبہ کر لو تو تمہارے دل تو اس کی طرف مائل ہو ہی چکے ہیں''۔ ﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ

الْمُؤْمِنِيْنَ ج﴾ ''اور اگر تم ہمارے نبی کے خلاف ایکا کرو گی تو جان رکھو کہ اللہ خود اپنے رسول کا رفیق ہے' پشت پناہ ہے اور ساتھ ہی جبریل ہیں (جو ملائکہ کے سردار ہیں) اور تمام مؤمنین صالحین (یعنی آپؐ کے اصحابؓ آپؐ کے پشت پناہ ہیں)''۔ ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴾ ''اور اس کے بعد تمام ملائکہ بھی ہمارے نبیؐ کے ساتھی اور مددگار ہیں' — یہاں اہل ایمان کا ذکر تو صالحیت کی صفت کے ساتھ کیا گیا ہے' لیکن ملائکہ کے لیے فرمایا کہ کُل کے کُل ملائکہ' کیونکہ وہ تو سب کے سب ہی صالح ہیں' ان کے بارے میں تو کوئی دوسری رائے ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کا معاملہ تو یہ ہے کہ: ﴿يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾ ''وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے''۔

آگے پھر وہی تہدید کا انداز چل رہا ہے جس میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی سامنے آتی ہے کہ تمہارے اندر جو یہ اوصاف ہیں کہ تم اطاعت شعار ہو' ایماندار ہو' فرمانبردار ہو' توبہ کرنے والیاں ہو' زہد و قناعت اختیار کرنے والیاں ہو' ان پر تمہیں نازاں نہیں ہونا چاہیے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ اللہ تم جیسی یا تم سے بہتر خواتین اپنے نبیؐ کے لیے ازواج کے طور پر فراہم نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں تمہیں بالفرض اپنے اسلام و ایمان پر' اپنے تقویٰ و احسان پر اور اپنی نیکیوں اور عبادت گزاریوں پر زعم ہو گیا ہے (اگر اس کا کچھ بھی امکان ہے) تو جان لو کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیں تو اللہ ان کو تم جیسی بلکہ تم سے بھی بہتر بیویاں عطا کر سکتا ہے۔ یہ مفہوم ہے آیت کے ان الفاظِ مبارکہ کا کہ ﴿عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ﴾ ''ثَــيِّبَات'' ان خواتین کو کہا جاتا ہے جن کی ایک دفعہ شادی ہو چکی ہو' یعنی بیوہ یا مطلقہ ہوں اور ''اَبکار'' سے کنواری خواتین مراد ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں اکثر خواتین شوہر آشنا تھیں لہٰذا ان کا ذکر بھی یہاں کر دیا گیا' کیونکہ ایک خاتون جسے متاہل زندگی کا تجربہ پہلے ہو چکا ہو بعض پہلوؤں سے اس کی رفاقت شوہر کے لیے آسانی کا موجب بن جاتی ہے۔ رہا اَبکار یعنی کنواریوں کا معاملہ تو ہر شخص کے

لیے کسی خاتون کا بیوی کی حیثیت سے یہ نہایت پسندیدہ وصف ہے ہی۔

ان تین آیات میں ایک خاص واقعہ کے حوالہ سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے خطاب کیا گیا ہے' جس سے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ ازدواجی زندگی میں اگرچہ باہمی محبت والفت' شفقت ومودّت' ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کا لحاظ' حسن معاشرت اور نرمی کا سلوک مطلوب ہے' لیکن ایسا نہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں بیویوں میں شوخی کا انداز حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ کا اصول مجروح ہو جائے جو ہماری خاندانی زندگی کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر خاندان کا ادارہ کمزور ہو جائے تو اس کے اثرات سارے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں' اس لیے اس اصول کو ایک واقعے کے حوالے سے ذہن نشین کروایا گیا ہے۔

عائلی زندگی کو صحیح بنیادوں پر استوار رکھنے اور ''گھر'' کو امن وسکون کا گہوارہ بنانے کے لیے ان آیات میں مسلمان عورتوں کو ایک اہم سبق یہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رازوں کی امانت دار اور محافظ بنیں۔ قرآن میں ان کی صفت ''حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ'' یعنی ''رازوں کی حفاظت کرنے والیاں'' بتائی گئی ہے۔ بیوی فطری طور پر بھی گھر کے رازوں کی امین ہوتی ہے' لیکن اگر وہ خود ہی اس امانت کی حفاظت نہ کر سکے تو عائلی زندگی جن الجھنوں کا شکار ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

تربیتِ اولاد اور والدین کی ذمہ داریاں

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝٦ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝٧﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے' جس پر نہایت تندخو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا

جاتا ہے اسے بجا لاتے ہیں۔ (اُس وقت کہا جائے گا کہ) اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو، تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جو عمل تم کیا کرتے تھے''۔

سورۃ التحریم کی چھٹی آیت میں ایک مسلمان خاندان کے سربراہ کی ذمہ داری مثبت انداز میں امر کے صیغے میں بیان کی جا رہی ہے۔ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں یہ مضمون دو مواقع پر پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ سورۃ التغابن میں اہل ایمان کو خبردار کیا گیا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ﴾ ''اے اہل ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، پس ان سے ہوشیار رہو''۔ اگرچہ ہماری اجتماعی زندگی کا جو نقشہ ہے اس کی بنیاد میں مال و اولاد کی طبعی محبت ہی کارفرما ہے۔ یہ محبت اپنی جگہ صحیح اور درست ہے، لیکن بسا اوقات یہ طبعی و فطری محبت حدِّ اعتدال سے تجاوز کر کے اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال کی محبت کی وجہ سے اللہ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی فرمائشیں پوری کرنے، اولاد کو اچھے سے اچھا کھلانے پلانے اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے انسان حرام میں مُنہ مارنے لگتا ہے۔ گویا یہ محبت نتیجہ کے اعتبار سے اس کے لیے محبت نہیں بلکہ عداوت بن جاتی ہے اور اس کی عاقبت کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔ اس آیت میں اسی حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اسی فطری محبت کا ذکر ایک مثبت انداز سے ہوا ہے۔ ایک بندۂ مؤمن کے دل میں یہ فطری تمنا ہوتی ہے کہ اس کے اہل و عیال بھی ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ یہ تمنا اور آرزو اِس قرآنی دعا کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ۝۷۴﴾ (الفرقان)

''جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا''۔

یہی مضمون سورۃ التحریم کی زیرِ نظر آیت میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ یعنی

ایک مسلمان کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال کے نان نفقہ کا اہتمام کرے‘ انہیں کھلائے پلائے‘ ان کے رہن سہن کی ضرورتیں پوری کرے۔ یہ تو جبلی طور پر ہر انسان کرتا ہے۔ ایک خاندان کے سربراہ کے مؤمن و مسلم ہونے کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے جن کو بطورِ امانت اس کے حوالے کیا ہے وہ ان کے صحیح حقوق کی ادائیگی کی فکر کرے۔ اس امانت کا حق اس طرح ادا ہوگا کہ ان کی بہتر سے بہتر دینی تربیت کی کوشش کرے تاکہ وہ صحیح رُخ پر پروان چڑھیں۔ لیکن اگر اسے اس ذمہ داری کا احساس نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ایک مسلمان خاندان کا سربراہ اپنی ذمہ داری کو بحیثیت ایک مسلمان ادا نہیں کر رہا۔

اس طرف متوجہ کرنے کے لیے قرآن مجید کا انداز بڑا فطری ہے۔ تنبیہہ کا آغاز ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ﴾ ’’اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو‘‘ کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں قیامت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے کہ اُس روز ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہوگی۔ اُس وقت ہر شخص بھول جائے گا کہ کون میرا بیٹا ہے‘ کون میری بیوی ہے اور کون میرا باپ ہے! سورۂ عبس میں آتا ہے: ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾﴾ ’’آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز ہوگی۔ اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا‘‘۔ اور سورۃ المعارج میں فرمایا گیا کہ:

﴿وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ يُبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ ﴿۱۴﴾﴾

’’اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا‘ حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو‘ اپنی بیوی کو‘ اپنے بھائی کو اور اپنے قریب ترین خاندان کو جو اُسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔‘‘

اسی لیے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ''بچاؤ اپنے آپ کو''۔ اور اس کے بعد اپنے قریب ترین افراد یعنی اہل خانہ' جن سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے' کو اس آگ سے بچانے کی ہدایت کی جا رہی ہے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

اس سورۂ مبارکہ کے خاص اسلوب سے اس آیت کا جو ربط و تعلق ہے اسے اس مقام پر نوٹ کر لیجیے۔ ہر سورۂ مبارکہ کا ایک عمود یعنی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کے ساتھ سورت کی ہر آیت منسلک اور مربوط ہوتی ہے۔ یہاں بھی دیکھئے کہ اولاد کی تربیت میں بسا اوقات لاڈ پیار حائل ہو جاتا ہے جو اولاد کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔ آپ بچے کی صبح کی میٹھی نیند میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے' اس لیے اسے فجر کی نماز وقت پر ادا کرنے کا عادی نہیں بنا رہے۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ وہ سوتا رہے۔ اب اگر آپ کی اس بے جا شفقت و محبت کے نتیجے میں وہ بچہ بعد میں نماز کا پابند نہ ہو سکا تو آپ خود سوچیے کہ آپ نے اس کے حق میں کتنے کانٹے بو دیے ہیں۔ اس کی تربیت اس طرح کس تباہی کے رُخ پر ہو رہی ہے اور اس کی زندگی عاقبت کے اعتبار سے کس خسارے کی راہ پر گامزن ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر اپنی بیویوں کے ساتھ لاڈ پیار اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اللہ کے احکام میں خلل پیدا ہو رہا ہے' حدود اللہ ٹوٹ رہی ہیں' اللہ کا تقویٰ نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے اور اس سے دل غافل ہو رہے ہیں تو اچھی طرح جان لیجیے کہ آپ کی طرف سے آپ کی یہ محبت نہ آپ کے حق میں نافع ہے اور نہ ان کے حق میں' بلکہ یہ دونوں کے لیے عداوت ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ایک نہایت جامع قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا ہے: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ))(۱) ''تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے ریوڑ کے بارے میں جواب دہ ہے''۔ جس طرح ایک چرواہا اور گلہ بان ان مویشیوں کی حفاظت کا ذمہ دار

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب المرأة راعیة فی بیت زوجھا ومتعدد دیگر مقامات۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضیلة الامام العادل......

اور مسئول ہوتا ہے جو اس کے چارج میں دیے گئے ہیں اور اس میں سے اگر کوئی جانور گم ہو جائے یا حادثہ کا شکار ہو جائے تو اُس چرواہے کا محاسبہ ہوتا ہے کہ اس جانور کی گمشدگی میں اس کی غفلت کا کتنا دخل ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر انسان کے حوالے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد کر دیے ہیں۔ اگر کوئی کسی دفتر میں افسر ہے تو جو اُس کے ماتحت ہیں' وہ گویا ایک گلہ ہے جس کا وہ نگہبان ہے۔ اس کو اپنی حیثیت کے تناسب سے اپنے ماتحتوں کے دین وایمان اور ان کی سیرت وکردار کے بارے میں فکرمند رہنا چاہیے کہ یہ چیزیں صحیح رُخ پر رہیں' کیونکہ وہ ذمہ دار اور مسئول ہے۔ اور خاندان کے سربراہ پر تو یہ اصول صد فیصد راست آتا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے ذمہ دار اور مسئول ہے۔

صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنے گھرانے کے قریب ترین افراد کو لے کر بیٹھتے تھے اور خصوصاً خواتین کا نام لے کر انہیں نصیحت فرماتے تھے۔ مثلاً اپنی لختِ جگر' نورِ نظر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

''اے فاطمہ! محمد (ﷺ) کی لختِ جگر! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو' اس لیے کہ اللہ کے ہاں تمہارے باب میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے''۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

''اے صفیہ! اللہ کے رسول کی پھوپھی! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو' اس لیے کہ اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے''۔

تو یہ ہے اللہ کے رسول ﷺ کا متوجہ کرنے' خبردار کرنے اور ترغیب وترہیب کا انداز۔ ہر مسلمان گھرانے کے سربراہ کا یہ وہ مثبت رول ہے جسے اپنے اہل وعیال کے ضمن میں ادا کرنے کے لیے اسے فکرمند رہنا چاہیے۔

اب دیکھئے کہ یہ بڑا لطیف اور بلیغ انداز اختیار فرمایا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آگ سے بچانے کی فکر کرو جس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ پتھروں کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔

انسان جب جہنم میں جھونکے جائیں گے تو گویا وہ اس کا ایندھن ہوں گے۔غور طلب بات یہ ہے کہ پتھروں کے ذکر میں کیا حکمت ہے! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذکر اس اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے کہ اس آگ کی شدت وحرارت کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک آگ تو وہ ہے جو لکڑیوں سے جلائی جاتی ہے اور ایک آگ وہ ہے جو پتھروں سے جلے گی۔ پتھر کے کوئلوں سے کسی زمانہ میں جو آگ جلا کرتی تھی اس کی حرارت کا ذرا تصور کیجیے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر سوچیے کہ اصل پتھر جس آگ کا ایندھن بن رہے ہوں' اس کی تُندی وتیزی اور شدت کا کیا عالم ہوگا!۔اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ بُت عموماً پتھروں سے تراشے جاتے ہیں اور انہیں معبود سمجھا جاتا ہے' ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں' ان کے آگے ماتھا ٹیکا جاتا ہے' ان سے حاجت روائی کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں' اس لیے مشرکوں کے ساتھ پتھروں کے یہ بُت بھی جہنم میں جھونک دیے جائیں گے تاکہ ان کی حسرت میں مزید اضافہ ہو کہ جنہیں ہم معبود سمجھے بیٹھے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ اس آگ میں جل رہے ہیں۔

آگے فرمایا: ''اس جہنم پر وہ فرشتے مامور ہیں جو بڑے سخت دل اور تندخو ہیں''۔ غور کیجیے! بہت ہی لطیف انداز ہے کہ آج تم بڑی محبت' شفقت اور لاڈ پیار کی وجہ سے اپنی اولاد کو بگاڑ رہے ہو' لیکن نتیجہ کے طور پر وہ اُن تُند خو اور سخت گیر فرشتوں کے حوالے ہوں گے جو جہنم کے کارندے اور داروغے ہیں اور ان کے دلوں میں کوئی نرمی اور محبت نہیں ہے۔تمہاری یہ چہیتی اولاد کتنی ہی فریاد کرے اُن فرشتوں کے دل پسیجیں گے نہیں۔ان کے دل میں رحم اور رأفت کا جذبہ رکھا ہی نہیں گیا۔وہ بڑے سخت دل اور تُند خو ہیں اور اُن کا حال یہ ہے کہ ''وہ اللہ کی طرف سے ملنے والے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے' اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے''۔

ان آیات سے فرشتوں پر ایمان کے بارے میں بھی رہنمائی ملتی ہے۔آپ جانتے ہیں کہ فرشتوں پر ایمان ہمارے ایمانیات کا لازمی حصہ ہے۔دنیا میں دیویوں اور دیوتاؤں کے تصورات درحقیقت ''فرشتوں پر ایمان'' ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

اس تصور میں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ فرشتوں کو بااختیار سمجھ لیا گیا۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ اگرچہ ملائکہ ایک نوری مخلوق ہیں اور ان کا رتبہ بہت بلند ہے لیکن وہ بااختیار مخلوق نہیں۔ اسی بات کو یہاں ان الفاظ مبارکہ سے واضح کیا گیا کہ: ﴿لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۝۶﴾ جب یہ حقیقت سامنے آ گئی تو اب ان کو پکارنا بے کار' ان سے دعا کرنا لاحاصل اور ان کو پوجنا بے فائدہ۔ لہٰذا اللہ کو پکارو' اللہ سے دعا کرو' اللہ سے مدد مانگو۔ اللہ تعالیٰ جس ذریعے سے چاہے آپ کی ضرورت پوری کر دے۔ وہ کسی انسان کے دل میں ڈال دے' کسی فرشتہ کو مامور کر دے' یہ اس کا اختیارِ مطلق ہے۔ فرشتے اس اعتبار سے ایک مجبور اور ناچار مخلوق ہیں کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی بڑی خوبصورت وضاحت سورۂ مریم میں آئی ہے۔ متعلقہ آیت کے بین السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے شکوہ کیا کہ اے جبریل! آپ وقفہ وقفہ سے آتے ہیں' ہمیں انتظار رہتا ہے۔ اس شکوہ کا حضرت جبریلؑ سے اللہ تعالیٰ نے جواب دلوایا کہ ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِیًّا۝۶۴﴾ ''اور (اے نبیؐ!) ہم آپ کے ربّ کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے' اور آپ کا ربّ بھولنے والا نہیں ہے''۔ یعنی نزولِ وحی میں وقفہ کسی بھول کے باعث نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی حکمتِ بالغہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اگلی آیت میں نقشہ کھینچا گیا کہ جب لاڈ پیار سے بگڑے تمہارے یہ لاڈلے اور پیارے جہنم میں جھونکے جائیں گے تو اُس وقت وہ معذرتیں کریں گے' دہائیاں دیں گے اور چیخ و پکار کریں گے تو ان کو جواب دیا جائے گا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ ؕ﴾ ''اے ناشکرو! آج بہانے مت بناؤ (معذرتیں نہ تراشو)''۔ اب اس کا کچھ حاصل نہیں۔ ﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝۷﴾ ''تمہیں بدلے میں وہی کچھ دیا جا رہا ہے جو تم کرتے تھے''۔ یہ تمہارے اپنے اعمال

ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ دنیا میں ان میں لذت اور سرور تھا۔ وہاں تمہاری بداعمالیاں ’’sugar coated pills‘‘ کی حیثیت رکھتی تھیں‘ جس کے باعث ان کی تلخی تم پر نمایاں نہیں ہوتی تھی اور جس انجام سے تمہیں دوچار ہونا تھا وہ تم پر واضح نہیں ہوتا تھا۔ تم نے اپنے افعال پر اپنی خواہشاتِ نفس کی coating کر رکھی تھی‘ اب وہ اتر گئی ہے‘ لہٰذا اس کی حقیقی و واقعی تلخی کا مزا ہے جو تم یہاں چکھ رہے ہو۔ یہ تمہارے وہی اعمال ہیں جو آج تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی اور تمہارے اپنے کرتوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس انجامِ بد سے ہم سب کو بچائے۔ آمین!

تَوْبَةً نَصُوْحًا کا ہمارے دین میں مقام

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ⑧ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ⑨﴾

’’اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔ اُمید ہے کہ تمہارا پروردگار تم سے تمہاری برائیوں کو دور فرما دے گا اور تمہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ اُس دن اللہ ہرگز رُسوا نہ کرے گا‘ نہ اپنے نبی کو اور نہ ان کے ساتھی اہل ایمان کو۔ ان کا نور دوڑتا ہوا ہوگا ان کے سامنے بھی اور ان کے داہنی جانب بھی۔ اور وہ یہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے لیے ہمارے اس نور کو پورا فرما دے اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما‘ یقیناً تجھے ہر شے پر قدرت اور ہر کام پر اختیار حاصل ہے۔ اے نبی (ﷺ)! کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے‘ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے‘‘۔

ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ تمام اہل ایمان کو توبہ کا حکم دے رہے ہیں' یا یوں کہہ لیجیے کہ توبہ کی ترغیب دے رہے ہیں' لیکن توبہ وہ ہو جو خالص توبہ ہو' جو خلوصِ دل سے کی گئی ہو' جو صحیح معنی میں توبہ ہو۔ ہمارے اس سلسلۂ دروس میں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کے ضمن میں توبہ کے موضوع پر بڑی مفصل گفتگو ہو چکی ہے اور توبہ کا فلسفہ' توبہ کی عظمت' ہمارے دین کی حکمت میں اس کا مقام اور توبہ کے صحیح ہونے کے لیے شرائط جیسے تمام امور زیر بحث آ چکے ہیں۔

موقع کی مناسبت سے میں یہاں ایک حدیث کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔اس کی ایک تو متفق علیہ روایت ہے' یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے جبکہ ایک ذرا تفصیلی روایت صرف مسلم شریف میں ہے۔اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو واضح فرمانے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی بندے کی توبہ سے کتنی خوشی ہوتی ہے' ایک تشبیہہ بیان کی ہے۔آپؐ نے فرمایا کہ ایک ایسے شخص کا تصور کرو جو کسی لق ودق صحرا میں تنہا سفر کر رہا ہے' اس کے پاس ایک اونٹنی ہے' اسی پر اس کا زادِ راہ یعنی راشن اور پانی وغیرہ ہے۔ وہ تھوڑی دیر سستانے کے لیے کسی درخت کے سایہ تلے بیٹھتا ہے' اونٹنی بھی پاس ہی کھڑی ہے۔ وہاں پر اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔اسی اثناء میں اس کی اونٹنی غائب ہو جاتی ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیوانہ وار اونٹنی کی تلاش میں کبھی اِدھر دوڑتا ہے' کبھی اُدھر بھاگتا ہے۔اس کے اضطراب اور بیتابی کا آپ خود تصور کر سکتے ہیں' اس لیے کہ وہ اونٹنی ہی درحقیقت اس کے لیے وسیلۂ حیات اور ذریعۂ زندگی ہے۔ وہی اس کی سواری ہے' اسی پر اس کا کھانا اور پانی ہے۔ وہ ہر چہار طرف بھاگ دوڑ کرنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ موت کے انتظار میں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔اچانک وہ آنکھیں کھولتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی اس کے پاس کھڑی ہے۔اس پر وہ اپنی خوشی کی شدت کے باعث ایسا بوکھلا اٹھتا ہے کہ کہنا تو یہ چاہتا ہے کہ ''اے اللہ! تو میرا ربّ ہے' میں تیرا بندہ ہوں'' لیکن فرطِ جذبات سے اس کی زبان لڑکھڑاتی ہے اور اس سے الفاظ نکلتے ہیں ''اے پروردگار! میں تیرا ربّ

ہوں' تو میرا بندہ ہے''۔ تصور کیجیے کہ اونٹنی دوبارہ پا لینے پر اس شخص کی فرطِ مسرت کا کیا عالم ہے! نبی اکرم ﷺ یہ تشبیہہ بیان کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اللہ کو اس سے بھی زیادہ خوشی اپنے کسی گنہگار بندے کی توبہ سے ہوتی ہے''۔ احادیث میں توبہ کی جو عظمت بیان ہوئی ہے اور جس قدر شدّ ومدّ کے ساتھ اس کی ترغیب دی گئی ہے اسے سامنے رکھئے اور پھر اس آیت کا مطالعہ کیجیے کہ تمام مسلمانوں سے' خواہ وہ کسی زمان ومکان سے تعلق رکھتے ہوں' خطاب فرمایا جا رہا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ﴾ ''اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ''۔

توبہ کے ضمن میں دو مزید احادیث بھی پیشِ نظر رہنی چاہئیں' جن میں نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں خود روزانہ ستر ستر اور سو سو بار اللہ کی جناب میں توبہ اور استغفار کرتا ہوں۔ ایک روایت صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' اس کے الفاظ ہیں: ((وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً))(۱) ''اللہ کی قسم! میں روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ کی جناب میں استغفار بھی کرتا ہوں' توبہ بھی کرتا ہوں''۔ دوسری روایت صحیح مسلم میں ہے جس کی رو سے نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((یَااَیُّهَا النَّاسُ' تُوْبُوْا اِلَی اللّٰهِ' فَاِنِّیْ اَتُوْبُ فِی الْیَوْمِ اِلَیْهِ مِائَةَ مَرَّةٍ))(۲) ''اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کرو' اس لیے کہ میں خود اُس کے حضور روزانہ سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں''۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی توبہ کے کیا معنی ہیں؟ حضور ﷺ سے کسی گناہ کے ارتکاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اچھی طرح جان لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کی توبہ اور آپؐ کے استغفار کا معنی ومفہوم کیا ہے! دراصل توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا' پلٹنا' لوٹنا۔ اس کے کم از کم چار درجے اگر ذہن میں رکھے جائیں تو بات واضح ہو جائے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' باب استغفار النبی ﷺ فی الیوم واللیلة۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار' باب استحباب الاستغفار والاستکثار منه۔

گی۔ایک شخص وہ ہے جو کفر سے توبہ کرتا ہے اور اسلام میں آتا ہے۔ ایمان لانا بھی ایک نوع کی توبہ ہے۔ جیسے ہم سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں پڑھ آئے ہیں: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ دوسری توبہ کسی مسلمان شخص کی ہے جو معصیت سے توبہ کرتا ہے' گناہ کو چھوڑ رہا ہے' گناہ سے رجوع کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت کی طرف۔ تیسری توبہ ہوگی اَبرار یعنی نیکوکاروں کی۔ کسی وقت ایک صالح اور نیک شخص کی قلبی کیفیت ایسی ہوسکتی ہے کہ معرفت الٰہی کے معاملے میں اس کے دل پر کچھ دیر کے لیے غفلت کا پردہ سا پڑ جائے۔ وہ محض غفلت ہے' اس سے کسی معصیت کا ارتکاب نہیں ہوا۔ اسے محض یہ احساس ہوا کہ میرے قلب پر کچھ دیر کے لیے غفلت کا حجاب طاری رہا ہے۔ اب وہ غفلت سے استحضار اللہ فی القلب کی جانب رجوع کر رہا ہے' دل میں اللہ کی یاد کو مستحضر کرنے کے لیے اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو رہا ہے' یہ بھی توبہ ہے۔ پھر ایک توبہ مقربین بارگاہِ الٰہی کی ہے۔ یعنی اُن کے قلب کا جو مضبوط تعلق اور رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ استوار رہتا ہے' اس کی شدت میں اگر کبھی کوئی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس حساسیت کے باعث وہ اس سے بھی توبہ کرتے ہیں اور اپنے تعلق مع اللہ کی اسی سابقہ شدت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ کیفیت جس کو مقربین یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی توبہ میں شمار کیا جاسکتا ہے کہ جب ان نفوسِ قدسیہ کو یہ محسوس ہو کہ کسی مصروفیت کے باعث ان کے تعلق مع اللہ کی شدت میں ذرا سی بھی کمی ہوگئی ہے تو وہ اس سے بھی توبہ کرتے اور رجوع فرماتے ہیں۔

اس تناظر میں آپ سمجھئے کہ کوئی صاحب ایمان ایسا نہیں ہے جو اس حکم یا اس ترغیب کا مخاطب نہ ہو کہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں توبہ کرو خالص توبہ!'' خالص توبہ کون سی ہوگی؟ اس کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے کہ کم از کم تین شرطیں پوری ہوں تو وہ خالص توبہ ہوگی۔ اگر حقوق اللہ کے ضمن میں کوتاہی ہوئی ہے تو (۱) شدید پشیمانی ہو (۲) مصمم ارادہ ہو کہ میں آئندہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا' اور (۳) انسان اس گناہ کے کام کو فی الواقع چھوڑ دے۔

اور اگر حقوق العباد کا معاملہ ہے تو مزید ایک شرط یہ ہوگی کہ یا تو اس شخص سے جس کی حق تلفی کی ہے' معافی حاصل کرے یا اپنے کسی عمل سے اس کے نقصان کی تلافی کرے۔

اس خالص توبہ کا مقام اور مرتبہ کیا ہے! اسے اسی آیت میں آگے بیان فرمایا: ﴿عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنۡکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ﴾ عربی زبان میں ''عَسٰی'' اور ''لَعَلَّ'' کے الفاظ عام طور پر تو ''شاید'' کے معنی میں آتے ہیں' لیکن قرآن مجید میں جب یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر وارد ہوتے ہیں تو شاہانہ اندازِ کلام کی رو سے اس کے معنی ہوتے ہیں ''تاکہ'' اور ''اُمید ہے کہ'' یعنی اس میں بشارت کا پہلو ہوتا ہے۔ لٰہذا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو دُور فرما دے گا'' ﴿وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''اور تمہیں اُن باغات میں داخل فرمائے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''۔

آگے فرمایا کہ اُس دن یعنی قیامت کے روز سب کے لیے رسوائی ہوگی' صرف انبیاء کرام علیہم السلام' ان کے پیروکار اور سب سے بڑھ کر النبی الخاتم جناب حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اہل ایمان اس رسوائی سے بچے ہوئے ہوں گے: ﴿یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ﴾ آگے فرمایا: ﴿نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ﴾ ''ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہوگا''— یہ بات جان لیجیے کہ انسان کے ایمان کا محل و مقام اس کا قلب ہے۔ ایمان حقیقت میں ایک روشنی ہے' ایک نور ہے۔ یہ بات ہم سورۃ النور کی آیتِ نور کے حوالے سے پہلے اچھی طرح سمجھ بھی چکے ہیں۔ اس قلب میں جو نورِ ایمان ہے' وہ میدانِ حشر میں ظاہر ہو جائے گا اور اس کی روشنی انسان کے سامنے پڑے گی۔ اسی طرح انسان کے نیک اعمال میں بھی ایک نورانیت ہے۔ البتہ اس دنیا میں اس کا ظہور نہیں ہوتا' میدانِ حشر میں اس کا ظہور ہوگا۔ نیک کاموں کا کمانے والا عام طور پر انسان کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے' لٰہذا میدانِ حشر میں انسان کے نیک اعمال کا نور اس کے داہنی جانب نمایاں ہوگا۔ ﴿نُوْرُهُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ﴾ ''دوڑتا ہوگا ان کا نور ان کے آگے اور ان کی داہنی

طرف‘‘۔ ﴿یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَ اغۡفِرۡ لَنَا ۚ﴾ ’’اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے ربّ! (اگر ہمارے نور میں کچھ کمی رہ گئی ہے تو) ہمارے لیے ہمارے نور کو پورا کر دے اور ہم کو معاف کر دے‘‘۔

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میدانِ حشر میں یہ نور ہر شخص کو اُس کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ملے گا۔ ایمان کے بھی مدارج و مراتب ہیں۔ ایک ایمان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے اور ایک ہما شما کا ایمان ہے۔ ان کے مابین ظاہر ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر ہمیں ایمان کی ذراسی رمق بھی میسر ہو تو وہ بھی ہمارے لیے بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نورِ ایمان اور کہاں ہمارا ایمان—! حضور ﷺ نے فرمایا کہ اُس روز میدانِ حشر میں لوگوں کو جو نور ملے گا تو کسی کا نور اتنا ہو گا کہ جیسے وہ مدینہ میں ہو اور اس کی روشنی صنعاء (یمن کے دارالحکومت) تک پہنچ جائے اور کسی کا نور بس اس قدر ہو گا کہ اس کے قدموں کے سامنے روشنی ہو جائے۔ جن کو اُس روز اتنا نور مل جائے وہ بھی بڑے نصیب والے اور کامیاب و کامران لوگ شمار ہوں گے‘ کیونکہ وہ اس کٹھن اور سخت مرحلہ سے گزر جائیں گے جس سے آگے ان کی منزلِ مراد یعنی جنت ہے۔ کم نور والوں کے نور کی حیثیت گویا اس ٹارچ کی روشنی کی سی ہو گی جس کو لے کر انسان کسی پگڈنڈی پر چل تو لیتا ہے۔ پس اس کٹھن مرحلہ کے لیے فرمایا کہ وہ لوگ دعا کر رہے ہوں گے کہ اے ہمارے ربّ! ہمارے نور میں ہماری کوتاہیوں کے باعث کمی رہ گئی ہے‘ پس تو ہمارے اس نور کا اتمام فرما دے اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما‘ ہمیں بخش دے۔ یہ ہمارے گناہ ہیں جن کی وجہ سے ہماری نورانیت میں کمی رہ گئی ہے‘ تُو اپنے خاص خزانۂ فضل سے اپنے خصوصی اختیار سے اس کمی اور تقصیر کی تلافی فرما دے‘ اس لیے کہ ﴿اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝۸﴾ ’’یقیناً تجھے ہر شے کا اختیار حاصل ہے‘‘۔

اس کے بعد اگلی آیت میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب ہے اور بظاہر یہ آیت اس سورت کے مضامین سے غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہے۔ ابھی تک ساری باتیں

آنحضورﷺ کے گھر والوں سے متعلق' اہل ایمان سے متعلق اور مسلمانوں کے عائلی نظام سے متعلق تھیں' لیکن یہاں یہ بات فرمائی گئی کہ: ﴿یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ ط﴾ ''اے نبی (ﷺ)! آپؐ کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے اور اُن پر سختی کیجیے''۔ وہ آپؐ کی نرمی' آپؐ کی مروّت' آپؐ کی شفقت اور آپؐ کی رحمتِ عمومی سے فائدہ اٹھانے نہ پائیں۔ وہ تو غلظت اور سختی کے مستوجب ہو چکے ہیں۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ آیت بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ التوبہ (آیت ۷۳) میں بھی وارد ہوئی ہے۔ سورۃ التحریم کے مضامین سے اس آیت کا بڑا لطیف ربط ہے۔ دراصل اس سورۂ مبارکہ کا مرکزی مضمون (Axis) یہ ہے کہ نرمی' شفقت' دلجوئی' کسی کے جذبات کا لحاظ اور پاس کرنا یہ فی نفسہٖ تو بہت اچھی باتیں ہیں' بہت مطلوب اور پسندیدہ ہیں' لیکن اگر اِن میں حدِّ اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہ چیز مختلف پہلوؤں سے خرابیاں پیدا ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ اولاد کے ساتھ بے جا لاڈ پیار اور بے جا نرمی کا معاملہ ہو تو اس کے بے راہ اور آوارہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ وہاں بھی نرمی مطلوب تو ہے لیکن ایک حد تک۔ اسی طرح جب انسان اپنے نفس کے معاملہ میں نرمی کرتا ہے تو خرابی کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ چونکہ ہمارا دین' دینِ فطرت ہے' لہٰذا اس میں ہمارے اوپر اپنے نفس کے حقوق بھی معین کیے گئے ہیں۔ رسول اللہﷺ کا ارشاد ہے: ((وَاِنَّ لِنَفْسِکَ [عَلَیْکَ] حَقًّا))(۱) ''اور بے شک تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے''۔ اس پر بے جا سختی پسندیدہ نہیں ہے۔ ہمارے دین میں رہبانیت جائز نہیں ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ((لَا رَھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ))(۲) ہمارے دین میں نفس کشی کی اجازت نہیں ہے' بلکہ ضبطِ نفس کی ہدایت ہے کہ اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھو۔ لیکن نفس کو بالکل کچل ڈالنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کے تقاضوں کو صحت مند اور جائز وحلال ذرائع سے پورا کرنے کی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعۃ' باب ما یکرہ من ترک قیام اللیل لمن کان یقومہ۔ وسنن الترمذی' کتاب الزھد عن رسول اللہﷺ' باب منہ۔

(۲) فتح الباری لابن حجر ۹/۱۳۔

اجازت ہے۔ اس نفس کے جو تقاضے ہیں وہ تمدن کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے ضروری ہیں' لہٰذا اس پر بھی نرمی کرو۔ لیکن اگر یہ نرمی حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جائے گی تو معصیت کی طرف لے جائے گی' لہٰذا اس کی باگیں تھام کر اور کھینچ کر رکھو۔ اسی طرح کا معاملہ کفار اور منافقین کا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی نرمی تمہارے دل میں نہ ہو۔ اہل ایمان کی جو شان قرآن مجید میں ایک سے زائد مقام پر آئی ہے وہ ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ﴾ کی شان ہے۔ یعنی وہ کفار کے حق میں نہایت سخت ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے نہایت رحیم و شفیق ہوتے ہیں۔ کفار کے لیے سختی کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ کہیں مسلمانوں کے جسد ملی میں انگلی نہ دھنسا سکیں' وہ مسلمانوں کو نرم چارا نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس تناظر میں نبی اکرم ﷺ کا معاملہ دیکھئے کہ آپؐ سراپا رحمت و شفقت ہیں۔ آپؐ کی یہ شان خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ آپؐ رؤف و رحیم ہیں' آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔ آپؐ میں نرمی' رقتِ قلب اور خلقِ خدا کے حق میں رأفت و رحمت کا معاملہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لہٰذا بسا اوقات اس سے کفار و مشرکین اور منافقین ناجائز فائدہ اٹھا جاتے تھے۔ چنانچہ آپؐ سے فرمایا گیا:

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ جَاہِدِ الۡکُفَّارَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۹﴾﴾

معلوم ہوا کہ اس سورۂ مبارکہ کا جو مرکزی خیال ہے اس کے ساتھ یہ آیت بھی مربوط ہے' اگرچہ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس سورت کے سیاق و سباق سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

عورت کا رُوحانی و اَخلاقی تشخص

﴿ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوا امۡرَاَتَ نُوۡحٍ وَّ امۡرَاَتَ لُوۡطٍ ؕ کَانَتَا تَحۡتَ عَبۡدَیۡنِ مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَیۡنِ فَخَانَتٰہُمَا فَلَمۡ یُغۡنِیَا عَنۡہُمَا مِنَ اللّٰہِ شَیۡئًا وَّ قِیۡلَ ادۡخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیۡنَ ﴿۱۰﴾ وَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا امۡرَاَتَ فِرۡعَوۡنَ ۘ اِذۡ قَالَتۡ رَبِّ ابۡنِ لِیۡ عِنۡدَکَ بَیۡتًا فِی الۡجَنَّۃِ وَ نَجِّنِیۡ مِنۡ

فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝۱۱ وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ
اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ
وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ۝۱۲ ﴾

''اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے کافروں کے لیےنوح اورلوط (علیہما السلام) کی بیویوں کی۔ وہ دونوں ہمارے دو نہایت نیک بندوں کے عقد میں تھیں‘ تو انہوں نے ان سے خیانت کی روش اختیار کی‘ تو وہ دونوں ان (اپنی بیویوں) کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے‘ اور یہ کہہ دیا گیا (ان بیویوں سے) کہ تم دونوں داخل ہو جاؤ آگ میں دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے اہل ایمان کے لیےفرعون کی بیوی کی۔ جبکہ اس نے کہا اے میرے ربّ! میرے لیے اپنے پاس ایک گھر جنت میں بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے نجات بخش ظالموں کی قوم سے۔ اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال بیان فرمائی ہے جس نے اپنی عصمت کی پوری حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور اس نے تصدیق کی اپنے ربّ کی تمام باتوں کی اور اس کی کتابوں کی اور وہ ہمارے بہت ہی فرمانبردار بندوں میں سے تھی''۔

یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ سورۃ التحریم میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل یعنی مرد اور عورت کے مابین رشتۂ ازدواج کہ جس سے خاندان کے ادارہ کی بنیاد پڑتی ہے‘ کے ضمن میں نہایت اہم اور بنیادی ہدایات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ عائلی زندگی کے بارے میں ایک نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ عورت کا مقام کیا ہے! آپ کو معلوم ہے کہ اس ضمن میں اس دنیا میں بہت افراط و تفریط رہی ہے۔ عورت کو یا تو بالکل بھیڑ بکری کی طرح ایک ملکیت قرار دیا گیا‘ ہمارے ہاں بول چال کے عام محاورے میں اسے جوتی کی نوک سے تعبیر کیا گیا‘ یا پھر اسے بازار میں لا بٹھایا گیا اور کبھی اسے قلوپطرہ کا روپ دھار کر قوموں کی قسمتوں سے کھیلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ یہ افراط و تفریط ہے جس میں نوعِ انسانی بالعموم مبتلا رہی ہے۔ اسلام نے عورت

کو ایک مکمل قانونی اور اخلاقی تشخص عطا کیا' پھر اس کے دائرۂ عمل اور میدانِ کار کا تعین کیا۔ اسلام کی رو سے عورت کا ایک علیحدہ قانونی وجود ہے۔ چنانچہ اس کے قانونی حقوق ہیں۔ عورت کی اپنی ذاتی ملکیت ہوسکتی ہے اور وہ اپنی اس ملکیت میں تصرف کا کامل اختیار رکھتی ہے۔ لہٰذا عام انسانی حقوق کے اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اس ضمن میں نہایت قابل غور پہلو یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو قانونی تشخص دینے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تشخص بھی عطا کیا ہے۔ عورت اگر کوئی نیک کام کرتی ہے تو اس کا اجر وثواب اُس کے لیے ہے۔ وہ اس معاملے میں مَردوں کے تابع نہیں ہے۔ چنانچہ شوہر اپنی بیوی کے نان ونفقہ کا کفیل اور ذمہ دار تو ہے' لیکن اس کے دین واخلاق کا کفیل اور ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر عورت میں نیکی اور بھلائی ہوگی تو وہ اس کے لیے ہے' عورت کوئی خیر کمائے گی تو اُس کا صلہ اور اجر وثواب اسی کو ملے گا۔ اسی طرح اگر مَرد کوئی نیکی کماتا ہے تو اُس کا اجر وثواب اسی کے لیے ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید نے یہ اصل الاصول بیان کیا ہے کہ ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿٣٩﴾﴾(النجم) ''کسی انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی کچھ جس کے لیے اس نے محنت کی ہے''۔ جس کے لیے اس نے مشقت اور بھاگ دوڑ کی ہے۔

پھر یہ کہ انسان ہونے کے ناطے سے مَرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹۵ میں فرمایا گیا: ﴿اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ﴾ ''میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے کسی بھی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں' خواہ وہ (عمل کرنے والا) مَرد ہو یا عورت ہو' تم ایک دوسرے ہی سے ہو''۔ یعنی مرد وعورت کا فرق وتفاوت خواہ جسمانی ہو' خواہ نفسیاتی ساخت کے اعتبار سے ہو' یہ فرق تو ہم نے تمدنی ضروریات کے تحت رکھا ہے' باقی انسان ہونے کے اعتبار سے تم ایک دوسرے ہی سے ہو۔

یہی اصول قرآن مجید میں سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں نہایت واضح شکل میں سامنے

آ تا ہے : ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ﴾ ''مَر دوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی''۔ یعنی جو بھلا ئیاں' نیکیاں' خیرات اور حسنات مَر دوں نے اپنی محنت اور مشقت سے کمائی ہیں' ان کا اجر وثواب ان کے لیے ہے اور جو بھلا ئیاں اور نیکیاں عورتوں نے کمائی ہیں' ان کا اجر وثواب ان کے لیے ہے۔ اسی طرح جو برائی اور بدی مَرد کمائے گا اس کا وبال اس پر ہوگا اور جو بدی اور برائی عورت کمائے گی اس کی پاداش اس کو بھگتنی ہوگی۔

اس اصول کو سورۃ التحریم کی آخری تین آیات میں تین مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ خواتین کہیں اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ اُن کے شوہر اُن کے دین واخلاق کے بھی کفیل ہیں اور وہ دین واخلاق کے معاملہ میں مَردوں کے تابع ہیں۔ چنانچہ پہلی مثال دو ایسی عورتوں کی پیش کی گئی جن کے شوہر اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر رسول تھے' ایک حضرت نوح اور دوسرے حضرت لوط علیہما السلام۔ ان دونوں کی بیویوں کا ذکر کیا گیا کہ دین کے اعتبار سے ان کا معاملہ درست نہ تھا۔ انہوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ اُن سے لازمی طور پر کوئی اخلاقی لغزش سرزد ہوئی ہو۔ اپنے شوہروں کے رازوں کا افشا بھی ایک خیانت اور بے وفائی کا عمل ہے۔ اس لیے کہ سورۃ النساء کی آیت ۳۴ میں جہاں یہ اصل الاصول بیان کیا گیا کہ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ یعنی مرد عورتوں پر نگران اور حاکم ہیں' وہاں ایک مثالی (ideal) بیوی کے یہ اوصاف بھی بیان فرمائے گئے ہیں کہ ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ﴾ ''پس نیک بیویاں وہ ہیں جو فرمانبرداری کی روش اختیار کریں (اپنے شوہروں کا کہنا مانیں اور ان کے) رازوں کی پوری حفاظت کریں''۔ ظاہر بات ہے کہ بیوی سے زیادہ مرد کا رازدار اور کون ہوگا! مَرد میں اگر کوئی خامی ہے' اگر کسی پہلو سے اس میں کوئی پوشیدہ جسمانی عیب ہے تو اسے اس کی بیوی سے بڑھ کر جاننے والا اور کوئی نہیں۔ گویا مَرد کی پوری شخصیت عورت کے پاس بطور امانت ہے۔

راز کو بھی امانت کہا گیا ہے۔ لہٰذا اگر شوہر نے کوئی راز کی بات بیوی کو بتائی ہو اور بیوی اس راز کو افشا کر دے تو یہ بھی خیانت ہے۔ چنانچہ ''فَخَانَتٰهُمَا'' کے لفظ سے یہ لازمی نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ ان دونوں جلیل القدر رسولوں کی بیویاں بدچلن اور بدکار تھیں (معاذ اللہ)۔ قرآن مجید کے اصول کو اگر پیشِ نظر رکھیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ کسی رسول کے حبالۂ عقد میں کوئی بدچلن اور بدکار عورت ہو۔ لہٰذا ان خواتین کا یہ طرزِ عمل کہ وہ در پردہ اپنی کافر قوموں کے ساتھ تھیں اور ان کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ تھیں' اسے یہاں خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن یہاں جو اصل بات واضح کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ دونوں عورتیں ہمارے رسولوں کے حبالۂ عقد میں تھیں لیکن چونکہ ان دونوں کے اپنے اعمال درست نہ تھے لہٰذا ان کا انجام کافروں کے ساتھ ہوگا اور رسول کی زوجیت میں ہونا انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿وَقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ۝۱۰﴾ ''اور ان سے کہہ دیا گیا دوزخ میں داخل ہو جاؤ دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ''۔ یہاں ''قِيْلَ''، فعل ماضی مجہول ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی قیامت کے حالات کا ذکر ہوتا ہے وہاں عام طور پر فعل ماضی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فعل ماضی میں قطعیت وحتمیت ہوتی ہے کہ کوئی کام ہو چکا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنی یقینی بات وہ ہوتی ہے جو وقوع پذیر ہو چکی ہو اتنی ہی یقینی بات قیامت وآخرت کی ہے۔ لہٰذا آخرت کے احوال بیان کرتے ہوئے قرآن مجید عام طور پر ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ یہاں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے' ہوسکتا ہے کہ اس میں عالمِ برزخ میں یہ بات کہی جانے کی طرف اشارہ ہو' واللہ اعلم بالصواب' لیکن یہاں جس حقیقت کی طرف نشاندہی مقصود ہے وہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث کے حوالے سے بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی لختِ جگر' نورِ نظر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا تھا کہ اے فاطمہ! محمد (ﷺ) کی بیٹی! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ' اس لیے کہ مجھے تمہارے بارے میں اللہ کے یہاں کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا —— یہاں فرمایا جا رہا

ہے کہ حضرت نوح اور حضرت لوط (علیہما السلام) جیسے جلیل القدر پیغمبر آخرت میں اپنی بیویوں کے کام نہ آ سکیں گے۔ یہ مثال بیان ہوئی ان دو عورتوں کی جو دو بہترین شوہروں کے حبالۂ عقد میں تھیں' لیکن چونکہ وہ خود اہل ایمان میں سے نہ تھیں لہٰذا اُن کے شوہروں کی نیکی اور بزرگی انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔

اب اس کے برعکس ایک مثال ایک بدترین شخص کے نکاح میں ایک نہایت نیک اور صالحہ خاتون کی آ رہی ہے۔فرعون جیسے سرکش و متمرد' اللہ کے باغی اور خدائی کے مدعی شخص کے عقد میں حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ اغلباً یہ وہی خاتون ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں بہتے ہوئے صندوق سے نکالا تھا اور فرعون کو آمادہ کر لیا تھا کہ ان کی پرورش وہ خود کریں گی۔ وہ یقیناً بنی اسرائیل کی کوئی مؤمنہ و صالحہ خاتون تھیں جو فرعون کی بیوی تھیں۔قرآن مجید کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ ان کی نیکی کا یہ عالم تھا کہ فرعون کا محل اور وہاں کی آسائشیں اور سہولتیں نیز وہاں کا آرام گویا ان کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔شوہر کی ضلالت' اس کی گمراہی و بے راہ روی اور اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے وہ عیش و آرام جو شاہی محل کا جزو لاینفک ہوتا ہے' ان پر دوبھر تھا۔ چنانچہ ان کی دعا قرآن نے بایں الفاظ نقل کی ہے: ﴿رَبِّ ابْنِ لِیْ عِنْدَكَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ وَنَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِیْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ⑪﴾ یعنی پروردگار! مجھے جلد سے جلد فرعون سے' اس کے عمل سے اور ظالم و مشرک قوم سے نجات دے کر اپنے پاس بلا اور اپنے جوارِ رحمت یعنی جنت میں میرے لیے گھر بنا۔اس دوسری مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی عورت کا شوہر خواہ کتنا ہی بدکردار یا کافر و مشرک ہو' اگر وہ عورت خود مؤمنہ اور صالحہ ہے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔شوہر کی برائی اسے کچھ نقصان نہ پہنچائے گی۔

اب اس ضمن میں تیسری مثال ایک ایسی خاتون کی آ رہی ہے کہ جنہیں ماحول بھی بہترین ملا اور پھر جن کے اپنے اندر بھی نیکی' بھلائی اور حسنات کے بہترین رجحانات اور میلانات بتمام و کمال موجود تھے۔گویا وہ نُورٌ علٰی نورٍ کی مثال ہیں —— پہلی

مثال بہترین شوہروں کے گھروں میں بدترین بیویوں کی تھی۔ دوسری مثال اس کے برعکس ایک بدترین شوہر کے عقد میں ایک بہترین خاتون کی تھی — اور اب تیسری مثال حضرت مریم سلامُ علیہا کی آ رہی ہے' جو خود بھی نیک' صالحہ اور عبادت گزار تھیں' پھر اُن کی والدہ بھی اس قدر نیک تھیں کہ انہوں نے ان کی پیدائش سے پہلے ہی اپنی ہونے والی اولاد کو اللہ کی نذر کر دیا تھا' جس کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۳۵ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا﴾ ''اے میرے ربّ! میں نے تیرے لیے نذر کیا جو کچھ میرے پیٹ میں ہے' دنیا کے تمام بکھیڑوں سے اسے چھٹکارا دلاتے ہوئے''۔ یعنی میں اس کو صرف تیرے دین کی خدمت کے لیے وقف کرنے کا عہد کرتی ہوں۔ تو یہ خاتون ہیں جن کی آغوش میں حضرت مریم نے پرورش پائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو اُن کا مربی اور کفیل بنایا جو اللہ کے جلیل القدر نبی اور ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کے مجاور اور نگران بھی تھے اور رشتے میں حضرت مریم کے خالو تھے۔ تو گویا یہ نُورٌ علٰی نورٍ کا معاملہ ہے۔ ایک طرف حضرت مریم سلامُ علیہا کی سیرت اور ان کا کردار ہے جس کی اللہ تعالیٰ مدح فرما رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی عصمت وعفت کی کامل طور پر حفاظت کی۔ پھر امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑی آزمائش سے دوچار فرمایا۔ ایک نوجوان خاتون جو نا کتخدا ہو' جس کی شادی نہ ہوئی ہو اور وہ حاملہ ہو جائے' آپ خود سوچئے کہ معاشرہ میں کیسی رسوائی کا سامان ہے جو اُن کے لیے فراہم ہو گیا! اللہ تعالیٰ نے انہیں کس شدید آزمائش میں مبتلا کیا! لیکن اس اللہ کی بندی نے اپنے ربّ کے ہر حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کیا ﴿وَصَدَّقَتْ بِکَلِمٰتِ رَبِّهَا وَکُتُبِهٖ﴾ یہ ان کی زندگی کا نقشہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے تمام احکام کی تعمیل کی۔ پھر انہوں نے تمام آسمانی کتابوں کی بھی تصدیق کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علومِ دینیہ سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ آیت کے آخر میں اُن کی مدح ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی گئی: ﴿وَکَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ⑫﴾ ''اور وہ اللہ کے فرماں برداروں میں سے (ایک بندی) تھی''۔

غور کیجئے کہ یہاں تین مثالوں کے ذریعے تین ممکنہ صورتوں کو بیان کر دیا گیا' لیکن ایک امکان ابھی باقی ہے۔ گویا اس عمارت کا ایک کونہ ابھی خالی ہے۔ بہترین شوہروں کے ہاں بدترین عورتوں کی مثال حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویاں ہیں' بدترین شوہر کے ہاں بہترین خاتون کی مثال حضرت آسیہ ہیں' جبکہ بہترین ماحول میں بہترین خاتون کی مثال حضرت مریم ہیں۔ اب ایک مثال رہ جاتی ہے کہ شوہر بھی بدترین ہو اور بیوی بھی۔ گویا ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ کا نقشہ ہو' جسے ہم اپنے محاورہ میں کہتے ہیں کہ کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ اس کی مثال ہمیں قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ملتی ہے اور وہ ہے سورۃ اللّھب۔ اس سورۂ مبارکہ میں ابولہب اور اس کی بیوی دونوں کا ذکر ہے:

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ① مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُـهٗ وَمَا كَسَبَ ② سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③ وَّامْرَاَتُـهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ④ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ⑤﴾

اس سورۂ مبارکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب اور آپؐ کی چچی (ابولہب کی بیوی) اُمِ جمیل کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت کا بیان ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عداوت' بغض اور دشمنی تھی' کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی' عداوت اور ایذا رسانی میں پیش پیش تھے۔ تو سورۃ اللّھب میں بدترین شوہر اور بدترین بیوی کی مثال موجود ہے۔ اس طرح یہ کونہ اور گوشہ بھی پُر ہو جاتا ہے کہ شوہر بھی بدترین ہو اور بیوی بھی بدترین ہو تو اس کی صورت کیا ہو گی۔ چنانچہ ان کے بارے میں اسی دنیا میں جہنم کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

اب ان چاروں مثالوں کو سامنے رکھ کر جو نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ عورت کا اپنا ایک ذاتی تشخص ہے۔ اس معاملہ میں عورت لازماً اپنے شوہر کے تابع نہیں ہے۔ وہ دینی و اخلاقی طور پر ایک آزادانہ تشخص کی مالک ہے۔ اس کے اندر اگر بھلائی' نیکی اور خیر

ہے تو وہ اسی کے لیے ہے‘ لیکن برائی‘ بدی اور سرکشی ہے تو اس کا وبال بھی اسی پر آئے گا۔ چونکہ اسلام کے عائلی نظام میں مالی اعتبار سے شوہر بیوی کا کفیل ہوتا ہے لہٰذا ہمارے ہاں بعض خواتین کو غیر شعوری طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ شاید نیک کام کرنا‘ بھلائیاں کمانا اور دین کی خدمت کرنا‘ یہ صرف مَردوں کے کرنے کا کام ہے‘ اور مَرد اگر یہ کام کر لیں تو عورتوں کے لیے کفایت کرے گا۔ اس مغالطہ کی ان آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں مکمل اصلاح ہونی چاہیے۔ اس کے لیے میں پھر وہی الفاظ دہرا رہا ہوں جو سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں آئے کہ: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبُوۡا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبۡنَ ؕ﴾ ’’جو کچھ مَردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے!‘‘

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین

☆ — ☆ — ☆

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ - اور - غلبہ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظِ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**